از مولانا ابوالحسن علی ندوی

عالمِ اسلام میں

تجدّد اور مغربیت کی تحریک

ترکی کو مغرب بنانے کی کوشش اور اس کے اسباب

مغربی تہذیب نے جس پیچیدہ صورت حال سے عالم اسلام کو دوچار کیا اس سے نمٹنے کیلئے ایک موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقید تمند اور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادتمند شاگرد کا ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرلے، اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالم اسلام کے ماحول سے بہت دور نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اسکی مکمل نقل کرنا چاہے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو۔

اس طرز فکر اور طریقۂ کار کا سب سے پہلے ترکی میں تجربہ کیا گیا، ترکی میں یہ رجحان بہت سے طبعی عوامل اور ایک طویل تاریخ کا نتیجہ تھا۔

ترکی نے ایک طویل عرصہ تک کسی تیاری اور دشمن کے علمی و صنعتی ہتھیاروں سے مسلح ہوئے بغیر یورپ کا مقابلہ کیا، اس نے یورپ سے مفید علوم، ضروری صنعتوں، فوجی تنظیم کے طریقوں کو اخذ کرنے اور ملک کو جدید طریقہ پر منظم کرنے کے ضروری کام میں کوتاہی اور تغافل سے کام لیا، علماء اور دینی رہنماؤں نے ملک و قوم کی علمی و فکری رہنمائی کے سلسلہ میں اس ذہانت و

جرأت اور محنت کا ثبوت نہیں دیا جسکی ان کے منصب کے لحاظ سے ان سے توقع تھی اور وہ ان رجحانات کی نگرانی نہ کر سکے جو اس ملک میں تیزی سے داخل ہو رہے تھے جن میں سے بعض فطری اور حق بجانب تھے، وہ اچھے بُرے اور مفید و غیر مفید تقاضوں میں تمیز نہ کر سکے اور علم و فکر کی اسی سرحد پر کھڑے رہ گئے جس سرحد سے علم کا قافلہ اٹھارویں صدی میں گزرا تھا[1] اور ان سب چیزوں سے بڑھکر یہ کہ ترکی کے آخری سلاطین نے مذہب اور خلافت کو اپنے مخصوص مصالح اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا، ملک کی پسماندگی فوجی انحطاط، مسلسل شکستوں اور ذلت انگیز ناکامیوں میں ان سلاطین کا بھی کبھی کبھی دخل ہوتا تھا، بعض اوقات ان سلاطین اور ان کے وزراء اور ارکان سلطنت نے دشمن سے بھی ساز باز اور قوم فروشی سے بھی احتراز نہیں کیا، یہ واقعات اگرچہ انفرادی تھے لیکن چھپے ڈھکے نہیں تھے اور نوجوان طبقہ کی برافروختگی کا اپنے اندر خاصا سامان رکھتے تھے۔

دشوار اور نازک مرحلہ | انیسویں صدی کے آخر میں ترکی کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ فطری اور قدرتی ہونے کے باوجود ایک اسلامی ملک کے لئے اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اسلامی معاشرہ کو اس سے پہلے دو طرح کے تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔ پہلا تجربہ وہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی کے اسلامی معاشرہ کو پیش آیا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ طاقتور، تازہ دم اور زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھا، اس کی حیثیت فاتح اور غالب طاقت کی تھی، اس کے بالمقابل دنیا کی دو قدیم و عظیم تہذیبیں تھیں، ایک مغرب کی رومی یونانی تہذیب، دوسری مشرق کی ایرانی تہذیب — دونوں تہذیبیں قدیم دنیا کے علوم و فنون، ثقافت و ادب، فلسفیانہ نظاموں کے ذخیرے اور تمدن و معاشرت کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں، اسلامی معاشرہ نے جو ہر طرح کے احساس کمتری سے محفوظ اور خود شناسی اور خود اعتمادی کی دولت سے بھرپور تھا بغیر کسی ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے اپنی ضرورت اور اپنے خیالات کے مطابق ان ذخیروں سے استفادہ کیا، جس چیز کو مناسب سمجھا اس کو بجنسہٖ اخذ کر لیا اور جس چیز کو نامناسب سمجھا اس کو پہلے اپنے سانچے میں ڈھالا، پھر اسکو اپنی صحیح جگہ فٹ کر لیا، آزاد اور غالب ہونے کی بناء پر یہ استفادہ اور اقتباس اس معاشرہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون نگار کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

کی روح اور اس کے اخلاقی رجحان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

دوسرا تجربہ وہ تھا جو اس اسلامی معاشرہ کو ساتویں صدی میں اس وقت پیش آیا جب تاتاریوں نے عالم اسلام کے مرکزی حصہ پر قبضہ کر لیا، اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیر نگیں ہو گئے، اس وقت اسلامی معاشرہ کو جس فاتح سے سابقہ پڑا، وہ تہذیب وتمدن، علم وفن، قانون و دستور میں بالکل فرومایہ اور تہی دست تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی، نہ زندگی کا کوئی فلسفہ، معاشرت واجتماع اور ذہنی نشوونما کے اعتبار سے وہ اس ابتدائی حالت میں تھا جو صحرائی اور جنگجو اقوام کی ہوا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اسلامی معاشرہ کے سامنے فاتح کی تہذیب، معاشرت، فلسفہ حیات اور افکار و اقدار سے متاثر و مستفید ہونے کا کوئی حقیقی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف فاتح قوم روز بروز اپنی مفتوح اقوام سے متاثر ہوتی چلی جارہی تھی، وہ بتدریج اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب، معاشرت، علوم وفنون، اس کے ترقی یافتہ طریقۂ زندگی اور اس کے اعلیٰ دینی عقائد اور خیالات سے متاثر ہوتی چلی گئی، بالآخر اس نے اپنی مفتوح اقوام کا دین اور ان کی تہذیب پورے طور پر قبول کر لی اور ان کے سانچہ میں ڈھل کر حرم کی پاسبان اور اسلام کی پرجوش علمبردار اور محافظ بن گئی۔

لیکن عثمانی ترکوں کو انیسویں صدی کے وسط میں جس صورت حال سے سابقہ پڑا وہ ان دونوں سابقہ صورتوں سے مختلف تھی، وہ اگرچہ آزاد اور ایک بڑی سلطنت کے مالک تھے، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ خود شناسی اور خود اعتمادی کا جوہر بہت کچھ کھو چکے تھے، ان میں نہ تو قرون اولیٰ کا جوش تھا، نہ ایمان ویقین کی وہ طاقت، اس کے بالمقابل مغربی تہذیب، نئی زندگی، نئی قوت سے معمور اور نئے جوش اور نئی امنگوں سے مخمور تھی، وہ اپنے ساتھ ایک ایسا صنعتی، علمی وفکری انقلاب لائی تھی جس کے حدود روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جارہے تھے اور جس سے صرف نظر کرنا ان ترکوں کے لئے ممکن نہ تھا جن کا مرکز سلطنت یورپ کے قلب میں تھا، اس تجربہ کو کامیابی سے گزارنے کے لئے اور اس سے فہمندانہ طریقہ سے نکلنے کے لئے انکو رہنمائی نہ گذشتہ اسلامی تاریخ سے مل سکتی تھی جس میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی، نہ موجودہ عالم اسلام سے جس کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا اور جو خود ترکی کے میدان میں پیش آرہا تھا، اور پورے عالم اسلام کی ترکی ہی پر نظر جمی ہوئی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں کون سا موقف اختیار کرتا ہے، اور ممالک اسلامیہ کو کیا رہنمائی دیتا ہے۔؟

اس نازک اور دشوار تجربہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کی ذہانت، اسلام اور مغربی تہذیب سے گہری واقفیت اور بہت بڑی جرأت کی ضرورت تھی، یہ درحقیقت ایک مجتہدانہ کام تھا جس کو ترکی کو چار و ناچار انجام دینا تھا، جس میں سارا عالم اسلام اسکی تقلید اور پیروی کے لئے تیار تھا، اسی کام کی تکمیل پر عالم اسلام کے تہذیبی و فکری اور کسی حد تک دینی و سیاسی مستقبل کا بھی انحصار تھا، اس ضرورت کو نہ تو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر اس سے گزرا جا سکتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی مہلت لی جا سکتی تھی، یہ ایک ناگزیر فریضہ تھا، جس کو جلد سے جلد ادا ہونا چاہیئے تھا، اور جس کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھنا چاہیئے تھا۔

قدیم و جدید گروہ | اس فریضہ کی تکمیل کے لئے ترکی کے دو گروہوں پر نظر پڑتی تھی، ایک قدیم علماء کا گروہ جو افسوس ہے کہ جدید تقاضوں اور جدید تبدیلیوں سے بہت حد تک ناواقف تھا اور اس خطرہ کی سنگینی سے بہت حد تک بے خبر تھا جو یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکی کے لئے پیدا کر دیا تھا۔ اس گروہ نے سلطان سلیم ثالث (۱۷۸۹ء، ۱۸۰۷ء) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۰۸ء، ۱۸۳۹ء) کی نئی فوجی تنظیمات اور جدید اصلاحات کی بھی مخالفت کی تھی جو انہوں نے ترکی کو عسکری و علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لئے نافذ کی تھیں۔

جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے (جو پیرس، برلن اور لندن یا خود اپنے ملک کی بعض جدید مغربی طرز کی تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم تھی) اس کا نشو و نما، دین کی بے وقعتی، دینی مستقبل سے مایوسی، اہل دین کی تحقیر، مغربی تمدن کی غیر محدود تقدیس و عقیدت، مادی اقدار اور مغربی رجحانات و خیالات کے سامنے مکمل سپر انگندگی پر ہوا تھا، اس نسل میں اس دور رس اور بالغ نظر فکر کا فقدان تھا جو مغربی فلسفۂ حیات کی تنقید پر قادر ہو اور یہ محسوس کر سکتا ہو کہ اس کے کمزور حصے کیا ہیں، کس جگہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، کیا چیزیں ترکی کے لئے (جو عالم اسلام کا قائد و رہنما تھا) مفید ہیں اور ان سے استفادہ و اقتباس جائز بلکہ ضروری ہے، اور کیا چیزیں اس کے مزاج اور تاریخ، دنیا میں اس کے مقام اور کردار سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اس کے بلند قامت پر راست نہیں آتیں۔؟

اس نسل کی قیادت زیادہ تر ان معلمین یا فوجی تعلیم حاصل کرنے والوں پر مشتمل تھی جن کی ثقافت نہ وسیع تھی، نہ گہری، نہ آزاد، یا وہ لوگ تھے جنہیں ان کی زندگی کے کچھ خاص تجربات، علماء اور قدامت پرستوں کی سرد مہری، بے توجہی اور تنگ نظری، قدیم نسل اور اس کے رہنماؤں میں

نفاق اور قول و عمل کے تضاد کا تجربہ کرتے اور ملک میں انحطاط و پسماندگی کے عام مناظر کے مشاہدہ نے ہر قدیم چیز اور ہر قسم کے موجودہ نظام سے متنفر و باغی بنا دیا تھا اور ترکی کو جلد سے جلد "مغرب" بنا دینے کے کام پر آمادہ و کمربستہ کر دیا تھا۔[1]

ضیاء گوک الپ اور ان کا نظریہ | فکری و ذہنی تعمیر کے میدان میں ترکی کو ضیاء گوک الپ[2] جیسے لوگ ملے جنہوں نے بلند آہنگی اور جوش کے ساتھ ترکی کو اپنے ماضی قریب سے علیحدگی

---

[1] مشہور ترک فاضلہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں :-

"اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے، ابتداء میں ان میں ایک بھی شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تخیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانے کے فرق کو سمجھ سکے، مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے، ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو وطنیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کیلئے سب کچھ کر گزرتے ہیں، اس لئے گو وہ اعلیٰ مقاصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل بے تکلف اختیار کر لیتے تھے۔۔۔۔"

(ص ۶۸، ص ۶۹... ترجمہ شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

[2] ضیاء گوک الپ کی ولادت دیار بکر میں ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں ہوئی، اس کا خاندان حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہے۔ ملٹری سکنڈری اسکول کے بعد دیار بکر کے سکنڈری سکول میں داخل ہوا، اس کو ادب و ریاضی کا خاص ذوق تھا، تاریخ سے بھی اچھی واقفیت تھی، اسکول ہی میں ضیاء نے فرنچ اور مشرقیات کی تعلیم شروع کی اپنے فاضل چچا کی مدد سے مفکرین اسلام، غزالی، رومی، ابن عربی، ابن رشد، ابن سینا اور فارابی وغیرہ کا مطالعہ کیا، وہ امام غزالی کے المنقذ من الضلال سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس لئے کہ وہ بھی ذہنی کشمکش سے دوچار تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلاب فرانس کے افکار و خیالات ترکی کی جدید نسل کے خون میں جوش پیدا کر رہے تھے، ضیاء کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر آزاد خیالی اور حریت پسندی کے خیالات رکھتا تھا، اس وقت دیار بکر میں ترکی رہنماؤں اور حریت پسندوں کا ایک جلاوطن گروہ موجود تھا جس سے ضیاء نے روابط پیدا کئے، ضیاء نے اسی سلسلہ میں نامق کمال، ضیاء پاشا، احمد مدحت آفندی وغیرہ کے مضامین پڑھے، عبداللہ کی آمد کے بعد اس کا خفیہ تحریک سے ارتباط بڑھ گیا، یہ گروہ ڈاکٹر ملحد تھا اور ہیکل (HAECKEL) بشنر (BUCHNER) سپنسر

اور خالص قومی اور مادی بنیادوں پر تعمیر و تشکیل جدید کی دعوت دی، ضیاء گوک الپ نے مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ دراصل اس قدیم تمدن کے امتداد و تسلسل کی ایک شکل ہے جس

(SPENCER) اور لی بون (LE BON) سے بہت متاثر تھا، اسی زمانہ میں ایک یونانی استاد کے اثر سے اس کے اندر عقیدے اور عقلیت کی کشمکش پیدا ہوئی، اس نے اسلامی فلسفہ اور تصوف سے تشفی حاصل کرنا چاہی مگر بقول اس کے اس میں اسکو کامیابی نہیں ہوئی اور وہ ارتیابیت (AGNOSTICISM) میں گرفتار ہو گیا۔ ۱۸۹۶ء میں وہ قسطنطنیہ گیا اس کو صرف ویٹرنری کالج (VETERINARY COLLEGE) میں وظیفہ مل سکا، لیکن وہ تعلیم سے زیادہ سیاست سے دلچسپی لیتا تھا اسی بناء پر انجمن اتحاد و ترقی کا رکن چن لیا گیا جو فری میسن کی طرح خفیہ کام کرتی تھی، اس کی بعض باغیانہ تحریروں کی بناء پر کالج سے اس کا اخراج ہوا اور وہ گرفتار کر لیا گیا، جیل سے چھوٹنے کے بعد اسکو دیار بکر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں اس نے گہرا مطالعہ کیا، اسکی توجہ اور دلچسپی کے خاص مضامین مغربی بالخصوص فرانسیسی فلسفہ، سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے، وہ جلد دیار بکر کی حریت پسند عنصر کی مرکزی شخصیت بن گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اس عنصر نے ضیاء کی قیادت میں جابرانہ نظام اور انتظامی مشینری کے خلاف بغاوت کر دی، ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید خان کی معزولی کے بعد ضیاء اور اس کے رفقاء آزادی سے کام کرنے کے قابل ہوئے۔ اس نے دو اخبارات "پیام" اور (DECLE) جاری کئے۔

سالونیکا میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد ضیاء ترکی کا ایک قوم پرست لیڈر بن گیا، یہاں ترکی کے اس مغربی سرحدی علاقہ میں رہ کر اس کو روشن خیال ترک اور مغربی فضلاء سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ اور اس کے اندر ترکی قومیت کی بنیاد پر اتحاد و تنظیم کے فکر نے نشو و نما حاصل کی جس میں اسلام بنیادی عامل (FACTOR) کی حیثیت نہیں رکھتا ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے نتیجہ میں ترکی کے زیر حکومت متعدد اسلامی ممالک (۱۹۱۲ء میں البانیہ اور ۱۹۱۶ء میں حجاز) نکل گئے جس سے تحریک قومیت وطنیت قدرۃً زیادہ معقول اور حقیقت پسندی پر مبنی نظر آنے لگی، ترکی کی نئی نسل پر گوک الپ کا ذہنی اثر اس وقت بہت مستحکم اور وسیع ہو گیا، جب وہ ۱۹۱۵ء میں (محض اپنی ذاتی قابلیت اور مضامین کی بناء پر بغیر کسی علمی سند و فراغت کے) استنبول یونیورسٹی میں علوم عمرانیہ کا استاذ اول مقرر ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں دوسرے محب وطن ترکوں کیطرح اس کو بھی استنبول چھوڑنا پڑا، ۱۹۲۱ء میں جب مصطفٰے کمال نے یونانیوں پر فتح حاصل کی تو وہ رہا ہوا، ۱۹۲۲ء میں وہ ہیئت تالیف و ترجمہ کا صدر نامزد ہوا۔ وہ کمال کا پر جوش حامی تھا، اور انتخاب میں اس نے اس کے لئے بڑا کام کیا تھا، اگرچہ ان سے اس کے ذاتی تعلقات کبھی گہرے نہیں ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں جب پارلیمنٹ منتخب

کے نشوونما اور حفاظت میں (بقول اس کے) ترکوں کا خاص حصہ رہا ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے :-

"مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا امتداد (CONTINUATION) ہے، اس تہذیب (جسکو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سمیری (SUMERIANS) سیتھی (SCYTHIANS) فینقی (PHOENICIANS) رعاۃ (HYKSOS) ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔۔۔ تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لئے کہ وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے عرصہ بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے" [1]

مغربی تہذیب کا اختیار کرنا کیوں ضروری ہے، اس انتخاب و اختیار کے نتیجہ میں کیا انقلاب رونما ہوگا اور ترکی کے جسد مردہ میں کس طرح نئی قوت اور نئی روح پیدا ہو جائے گی۔؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے :-

"جب کوئی قوم اپنے نشوونما ارتقاء کا ایک بڑا فاصلہ طے کر چکتی ہے تو اپنی تہذیب کا تبدیل کرنا بھی ضروری سمجھتی ہے۔ جب ترک خانہ بدوش قبائل کی حیثیت سے وسط ایشیا میں تھے تو اس وقت وہ مشرق بعید کی تہذیب کے اثر میں تھے،

ہوئی اس میں وہ دیار بکر کا نمائندہ تھا، ۱۹۲۴ء میں وہ علیل ہوا، کمال اتاترک نے یورپ میں اس کے علاج کے مصارف کی ساری ذمہ داری لینے کا وعدہ کیا۔ گوک الپ نے صرف اس خواہش کا اظہار کیا اس کے خاندان کا خیال رکھا جائے اور اس کی اس تصنیف کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ جو ترکی تہذیب کے موضوع پر ہے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ۴۸ یا ۴۹ سال کی عمر میں انتقال کیا اور مقبرہ سلطان محمود میں دفن ہوا۔

(ماخوذ از کتاب FOUNDATIONS OF TURKISH NATIONALISM از HEYD. U)

[1] GOKALP ZIYA: TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION. P-267

(باختصار)

9888

جب سلطنت (عثمانی) کے عہد میں آئے تو یہ نظیمی دائرہ اثر میں داخل رہے اور جبکہ وہ عوامی دورِ حکومت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، انہوں نے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے[1]"

وہ ثابت کرتا ہے کہ اس انتخاب سے ترکی کی اسلام سے علیحدگی ضروری نہیں :-

"معاشرے، مذاہب و ثقافت کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک تہذیب اختیار کر سکتے ہیں، جاپانی اور یہودی مذہب و عقیدہ میں اختلاف کے باوجود اہل مغرب کے ساتھ ان کی تہذیب میں برابر کے شریک ہیں[2]"

وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مذہب اور تہذیب دو مختلف چیزیں ہیں، "اسلامی تہذیب" یا "مسیحی تہذیب" ایک قسم کا مغالطہ ہے، مذہب عقیدے اور بعض عبادات و مراسم تک محدود ہے جس کا علوم و فنون سے کوئی رشتہ نہیں۔

"کوئی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جو ان گروہوں کے درمیان مشترک ہو جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، جب واقعہ یہ ہے کہ مذہب صرف ان مقدس ارادوں، عقائد اور مراسم کے مجموعہ کا نام ہے تو وہ ادارے جو مذہبی تقدس نہیں رکھتے (مثلاً سائنسی افکار، صنعتی آلات و اوزار، جمالیاتی معیار) ایک علیحدہ نظام کی تشکیل کرتے ہیں جو مذہب کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے، ایجابی علوم جیسے ریاضیات، طبعیات علم الحیات، نفسیات، عمرانیات، صنعتی طریقے اور فنون لطیفہ کا مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ کسی تہذیب کا بھی مذہب سے انتساب درست نہیں ہے۔ نہ مسیحی تہذیب کا وجود ہے نہ اسلامی تہذیب کا، ٹھیک جس طرح سے مغربی تہذیب کو مسیحی تہذیب کہنا صحیح نہیں، اسی طرح مشرقی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہنا بھی درست نہیں[3]"

اس انقلاب انگیز اقدام کے لئے وہ روس کی مثال دیتا ہے، جس نے قدامت پسند کٹر مسیحی

---

[1] TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION. P. 271

[2] " " " " " P. 269-270

[3] " " " " " P. 271-272

کلیسا کی پیروی اور مشرقی رنگ کی تہذیب سے تعلق رکھنے کے باوجود ترقی یافتہ مغربی تہذیب کو اختیار کیا اور مغرب کی آزاد و طاقتور قوموں کی صف میں کھڑا ہوگیا، وہ لکھتا ہے:-

"جب اہلِ مغرب نے اپنے کو قرونِ وسطیٰ کے اثرات سے آزاد کیا اس وقت روس کے آرتھوڈکس عیسائی اپنے کو آرتھوڈکس چرچ کا غلام سمجھتے تھے، چنانچہ روسی قوم کو بیزنطینی تہذیب سے آزاد کرنے میں اور مغربی تہذیب سے آشنا کرنے میں پطرس اعظم کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ جاننے کے لئے کہ کسی ملک کو نمونۂ مغرب بنانے اور اس کو یورپ کے رنگ میں رنگنے کے لئے کیا وسائل و اسباب اختیار کئے جا سکتے ہیں، تاریخ اصلاحات پطرس کا مطالعہ کرنا چاہئے اس زمانہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ روسی ترقی کے اہل نہیں ہیں، لیکن اس انقلاب کے بعد انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کئے، یہ تاریخی حقیقت اس بات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے کہ مغربی تہذیب ہی ترقی کی واحد شاہراہ ہے۔۔۔۔[1]"

پھر وہ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ آزادی اور قومی وقار کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنا اقتدار قائم کرنا ضروری ہے، لکھتا ہے:-

"ہم کو دو میں سے ایک راستہ لامحالہ اختیار کرنا ہوگا، یا تو ہم مغربی تمدن قبول کریں یا مغربی طاقتوں کا غلام رہنا پسند کریں۔ ہمیں ایک بات کا فیصلہ کرنا ضروری ہے، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی حریت کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنی سیادت قائم کریں[2]۔۔۔۔"

ضیا گوک الپ ترکی جدید کے فکری معماروں میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے، اس نے وہ فکری اساس اور جدید نقطۂ نظر مہیا کیا، جس پر ذہنی و اصولی حیثیت سے اس جدید ریاست اور جدید معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی، پروفیسر نیازی برکس نے اس کے منتخب مضامین کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر اسی کا انداز فکر

TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION. P. 215 [1]

" " " " " P. 266 [2]

اب تک چھایا ہوا ہے، وہ کہتے ہیں :-

" اگرچہ ضیاء گوک الپ کا انتقال اتاترک کے انقلابی اصلاحات کے ابتدائی دور ہی میں ہوگیا تھا۔ لیکن ان کی تحریروں میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں، جنہیں ان اصلاحات کی بنیاد کہا جاسکتا ہے، اسلامی اصلاح کے سلسلہ میں ان کے خیالات کو سب سے زیادہ نقصان شدت پسند سیکولرازم کے اس عہد میں ہوا جو اُن کے بعد فوراً ہی شروع ہوگیا تھا۔ پھر بھی بہرحال میرے نزدیک اگر وہ زندہ رہتے تو اتاترک کی پالیسی سے اپنے کو رضامند کر لینے میں کامیاب ہو جاتے، کیونکہ خلافت کے متعلق ان کے تصورات ان کے مغربی قومیت کے نظریہ کے منطقی نتائج سے یوں ہی مختلف تھے، خلافت کے موضوع پر اُن کے تصورات زیادہ تر ترکی قوم پرستی کو ایک آفاقی اور بین الاقوامی بنیاد دینے کی کوشش میں "خیالستانوں" پر مبنی تھے، اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ دستور میں سیکولرازم اور آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ فکر کی جو دفعات ہیں وہ انہیں کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں کیونکہ ۱۹۲۴ء میں جو نیا دستور اساسی بنانے کیلئے کمیٹی مقرر کی گئی تھی وہ اس کے ایک ممبر تھے۔ اتاترک نے مثالی اصلاح کی جو انقلابی پالیسی اختیار کی تھی اس سے وہ اپنے کو شاید ہم آہنگ نہ کر پاتے ..... اگرچہ عمل میں ان کے بعض نظریات سے ہٹ لیا گیا ہو پھر بھی ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر انہیں کا اندازِ فکر اب تک چھایا ہوا ہے۔"

آگے چل کر وہ ضیاء گوک الپ کا فکری و علمی کردار بیان کرتے ہوئے ایک فکری قائد اور ایک مکتب فکر کے بانی کی حیثیت سے اُسکی اہمیت کو اسطرح واضح کرتے ہیں :-

اگرچہ موجودہ عہد کے ترکی اور بیرونی عالموں کی تصنیفات کے مقابلہ میں تاریخ، عوامی تمدن اور اجتماعیات پر انکی خود تحقیقات زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہیں، لیکن اس سے راستہ کے امام اور بانی ہونے کی حیثیت سے ان کے مرتبہ میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا ہے، اگر ان کے بعض تصورات جدید ترکی میں آج بھلا دئے گئے ہیں، یا اگر وہ آج معمولی سمجھے جاتے ہیں اور ان میں پوری ندرت نہیں نظر آتی ہے۔ جبکہ اُن کے زمانہ میں وہ نئے اور اچھوتے خیال کئے جاتے تھے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نظریات، اب حقائق بن گئے ہیں اس سبب سے ان کے اثر کی گہرائی اور انکی نظر کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔"